© rasailojaraid.com

محمد الیاس میراں پوری

پروفیسر محمود الحسن قریشی......دوست نما استاد

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

مجھے ایم اے اردو کرنے کا خیال اُس وقت آیا جب میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا۔ میں دارِ بنی ہاشم مہربان کالونی ملتان میں رہائش پذیر تھا۔ اسی کالونی میں میرے ایک محترم استاد رہتے تھے۔ ہم دونوں اللہ کے زیرِ سایہ آباد تھے۔ مسجد کے اِس طرف میں اور اُس طرف استادِ محترم۔ اِدھر اذان ہوئی' اُدھر پروفیسر صاحب نماز کے لیے تشریف لے آئے۔ باقی نمازوں کے بعد تو وہ جلدی گھر چلے جاتے۔ لیکن نمازِ عصر کے بعد وہ مسجد کے قریب جہاں ہمارا دفتر ہے' تھوڑی دیر کے لیے بیٹھتے اور گپ شپ کرتے۔ گپ شپ کیا ہوتی۔ کبھی اشعار سنائے جارہے ہیں تو کبھی پھبتیاں کسی جارہی ہیں۔ کبھی لطائف کا سیلاب ہے تو کبھی مباحث کا ''سونامی''۔ غرض جتنی دیر بیٹھتے' محظوظ کرتے۔ ایک مجلس گرم رہتی لیکن کبھی گفتگو کی نوبت پایۂ ثقاہت تک نہ پہنچتی۔ وہ مجھے ''علامہ میراں پوری'' پکارتے۔ بروزنِ ''نیاز فتح پوری''، ''علی عباس جلال پوری'' (ان شخصیات کے ساتھ میری کوئی نسبت نہیں بنتی لیکن وہ یقیناً چاہتے تھے کہ میں بھی پڑھ کر مستقبل میں کچھ بنوں)۔ یہ اُن کی محبت کا ایک خوبصورت اور دلکش رنگ تھا' جس میں وہ یکتائے روزگار تھے۔

وہ ایسے شگفتہ انداز میں گفتگو کرتے کہ جی چاہتا' ان کی باتیں دیر تک سنی جائیں۔ اُن کے پاس مشکل سے مشکل مسئلے کا حل بھی موجود ہوتا۔ وہ لطیفہ، واقعہ یا ضرب المثل سنا کر اس مشکل کا حل بیان کردیتے اور مشکل واقعی حل ہوجاتی۔ جب میری اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے ایف اے کا امتحان پاس کیا ہوا تھا اور میں سوچا کرتا تھا کہ اُن میں یہ ساری شگفتگی اردو کا استاد ہونے کی وجہ سے ہے۔ جبکہ ان کی بیشتر گفتگو بالعموم سرائیکی اور بالخصوص ''رچناوی سرائیکی'' میں ہوتی ہے۔ پھر بھی میں اسے اردو کا کرشمہ سمجھتا رہا۔ میں نے سوچا کہ طبیعت میں شگفتگی کے لیے ایم اے اردو بہت ضروری ہے۔ جو بعد میں غلط ثابت ہوا۔ ہر چند جب میں نے بی اے کرلیا تو اس وقت ایم اے سرائیکی کی سہولت بھی موجود تھی لیکن میں نے اردو کو ترجیح دی۔ اس کی وجہ میرے استادِ محترم پروفیسر محمود الحسن قریشی مرحوم تھے۔ جو مجھے اس شفقت اور محبت سے سول لائنز کالج میں لے کر آئے جیسے وہ ہمیں کسی سیرگاہ میں لے کر جارہے ہوں۔ میں نے کالج آنا شروع کیا تو انہوں نے علالت کی وجہ سے آنا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں کالج میں نہ دیکھ کر میں اکثر یہ قطع گنگناتا تھا:

ہم زباں کوئی نہیں اور ہم سخن کوئی نہیں
رات گہری ہے چراغ انجمن کوئی نہیں
الفت و شوق کی تجدید کے داعی سب ہیں
پر وہ استاد ، وہ ''محمودحسن'' کوئی نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جناب محمود الحسن قریشی مرحوم کی شخصیت نے مجھے بہت متاثر کیا۔ انہوں نے ہمیشہ میری رہنمائی فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ آج میں ایم اے اردو کا طالب علم ہوں۔

محمود صاحب کی شخصیت ایک کتاب کی سی ہے جس کا ہر باب عمل کی اُس روشنائی سے لکھا گیا' جس کا نام وضع داری ہے اور اُس قلم سے تحریر ہوا ہے' جسے دیانت داری کہتے ہیں۔ اس پوری کتاب کا مطالعہ کریں تو ہمیں محسوس ہوگا کہ کہیں اس میں فرض شناسی کی عبارت ہے، کہیں اس میں احساس ذمہ داری کی سطور ہیں، کہیں اس میں صبر ہے، کہیں شکر ہے، کہیں ایثار ہے۔ میں جب بھی محمود صاحب سے ملا تو مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ جیسے میں کسی عہدے سے نہیں، کسی منصب سے نہیں بلکہ ایک کردار سے مل رہا ہوں۔ وہ ایک شاگرد دوست قسم کے استاد تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو غم زدہ اور دکھی نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے کبھی بھی انہیں کسی سے لڑتے یا الجھتے نہیں دیکھا۔ اُن کی شخصیت صدرنگ پھولوں جیسی تھی۔ جس کا ہر رنگ خوشنما اور ہر رنگ میں ایک خوشبو اور یہ رنگ اور یہ خوشبو صحرا کو گلستان بنا دیتی۔

استادِ گرامی جناب پروفیسر محمود الحسن قریشی کی شخصیت کے کئی پہلو تھے۔ ہر پہلو اپنے اندر ایک جامعیت رکھتا تھا۔ کامیاب استاد کی طرح انہوں نے ہمیشہ اپنے طالب علموں کے دلوں پر راج کیا۔ دورانِ تدریس وہ اپنی شگفتہ بیانی سے لیکچر میں ایسی دلچسپی پیدا کرتے کہ وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا۔

محمود صاحب کی شخصیت مرنجاں مرنج، بذلہ سنج، شگفتہ مزاجی اور برجستہ گوئی جیسی صفات سے متصف تھی۔ وہ ملتان کی ادبی محفلوں کی جان تھے۔ پوری محفل پر قابو پانا انہیں خوب آتا تھا۔ لطیفوں، پھبتیوں، جگت اور بذلہ سنجی میں انہیں مہارتِ تامہ حاصل تھی۔ وہ اکثر اوقات مزاح کرتے ہوئے اپنی ذات کو بھی شاملِ حال کر لیتے۔ پطرس بخاری اور ان میں یہی قدرِ مشترک ہے۔ گو وہ بخاری صاحب جیسے مزاح نگار اور ان کے ہم عصر نہیں تو لیکن ان جیسی شگفتہ طبیعت ضرور پائی۔

وہ ہر وقت خوش رہتے۔ میں نے انہیں کبھی بھی رنجیدہ خاطر نہیں پایا۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو بھی اس پیرائے میں بیان کرتے کہ اس میں لطیف کیفیت پیدا ہو جاتی۔ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ خوش طبع ہی رہے یہ اور بات ہے کہ بیماری نے انہیں نڈھال کر دیا تھا لیکن جب بھی وہ کوئی بات کرتے' اس میں شگفتہ پن، بذلہ سنجی کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور ہوتا تھا۔

پروفیسر محمود قریشی صاحب بنیادی طور پر مزاح نگار اور خاکہ نگار تھے۔ وہ نکتہ چینی اور نقطہ آفرینی کے فن میں اتارو تھے۔ وہ جس شخص کا خاکہ لکھتے یا جس پر مزاح کے تیر ونشتر چلاتے زخم خوردہ ہونے کے باوجود وہ داد ضرور دیتا جس پر وار کرتے وہ داد پہلے دیتا تھا اور پانی بعد میں مانگتا تھا۔ انہوں نے جس شخصیت پر بھی خاکہ لکھا اُس کے محاسن ومعائب کو بڑے خوبصورت اور دلکش پیرائے میں بیان کیا۔

پروفیسر محمود صاحب نے ایم اے اردو بہاء الدین زکریا یونیورسٹی ملتان سے کیا۔ ڈاکٹر انوار احمد اُن کے استاد تھے۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب کسی بات پر کلاس سے ناراض ہوگئے اور تین مہینے کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ گئے۔ جب وہ دوبارہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یونیورسٹی آئے تو کلاس کے سب لڑکوں نے انہیں منایا۔ اس موقع پر محمود صاحب نے اپنی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:

''ہم نے اندر کے درد و کرب کے جذبات چہرے پر لانے کی کوشش کی، منہ بسورا، رونے کی لاکھ کوشش کی۔ وہ تمام حربے استعمال کیے جو تعزیتی پروگراموں میں کیے جاتے ہیں مگر دیدے ایسے بے حیا ثابت ہوئے کہ نم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے اور یہ پہلا موقع تھا جب مجھے اپنے سُنی ہونے پر غصہ آ رہا تھا۔''

محمود قریشی صاحب نے جب ڈاکٹر انوار احمد کا خاکہ لکھا تو اس کا بڑا چرچا ہوا تھا اور یہ خاکہ مختلف رسائل و جرائد میں بھی شائع ہوا۔ وہ لکھتے ہیں:

''انوار احمد ہمارے ملک کا ابھرتا ہوا افسانہ نگار ہے جو گزشتہ بیس سال سے مسلسل ابھرنے کی کوشش کر رہا ہے۔''

پروفیسر حافظ اللہ یار فریدی کے خاکہ اپنے اندر مزاح کے تمام پہلو لیے ہوئے ہے:

''فریدی صاحب میرے والد صاحب کی قل خوانی پر اس قدر محبت و خلوص اور ذوق و شوق سے تشریف لائے کہ قل خوانی والے دن چچا حضور کا جنازہ انہوں نے ہی پڑھایا۔ پچھلے دنوں مجھے فرمانے لگے آپ کے گاؤں چلنا ہے۔ میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں نے عاجزی سے گزارش کی کہ حضور کے قدوم میمنت لزوم کی برکت ہے' اب کوئی قابل ذکر بزرگ نہیں بچا اور وہ بزرگ جو بچ گئے ہیں' ان کو ہم آپ کا نام لے کر ڈراتے ہیں۔''

''فرزندِ ملتان'' نامی کتاب پر محمود صاحب نے جہاں اور بہت ساری خوبصورت شخصی حوالہ جات سے مزاحیہ انداز میں جو حقائق بیان کیے ہیں' ان میں سے ایک جملہ سارے مضمون میں مذکورہ فرزندِ ملتان کی شخصیت کا پول کھول دیتا ہے:

''میں فرزندِ ملتان کو محکمہ تعلیم کا ایسا ماہر چوب تراش سمجھتا ہوں جس نے اپنی صلاحیتوں کا رندا جب بھی چلایا ذاتی مفاد کی کرسی ہی وجود میں لایا۔''

محمود صاحب اپنی شادی کا حال کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''ہم شیروانی زیب تن کیے، سلیم شاہی جوتا پہنے، مکھڑے پہ سہرا ڈالے خراماں خراماں سٹیج کی طرف بڑھ رہے تھے تو ہماری یہ خوشی بھی ایک ستم ظریف کے اس جملے نے اچک لی ''کیا خوبصورت ذوالجناح جا رہا ہے۔''

محمود صاحب نے اپنے ایم فل کا مقالہ بعنوان ''اردو افسانے میں پاکستانیت'' مکمل کیا تو یونیورسٹی نے اسے کافی سراہا اور اب اسے کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ محمود صاحب کو امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سے بڑی محبت تھی۔ وہ شخصیات جنہوں نے شاہ جی کو قریب سے دیکھا اور سنا تھا' محمود صاحب نے اُن سے رابطہ کر کے شاہ جی کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنا پی ایچ ڈی کا مقالہ بھی سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے حوالے سے تحریر کر رہے تھے۔ جس کا عنوان تھا: ''اردو ادب اور خطابت کی روایت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ''۔ محمود صاحب نے مقالہ کے دو ابواب لکھے تھے کہ کینسر جیسے موذی مرض میں مبتلا ہو گئے اور بیماری نے صحت یاب ہونے کی مہلت ہی نہ دی۔ باقی مواد تقریباً مکمل ہو گیا تھا مگر موت نے ترتیب کی مہلت نہ دی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محمود صاحب نے مختلف ادبی جرائد اور اخبارات میں بھی مضامین لکھے۔ احمد ندیم قاسمی کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ادبی جریدے ''فنون'' میں اُن کا ایک مضمون ''غلام عباس کا اچھوتا تجربہ'' آنندی'' شائع ہوا تو قاسمی صاحب نے اسے کافی سراہا۔

آج ہم میں محمود صاحب موجود نہیں۔ آج سول لائنز کالج اُن کی شگفتہ باتیں سننے کے لیے بے چین اور اُداس ہے۔ شعبہ اردو ویرانی کا سا منظر پیش کر رہا ہے۔ اساتذہ اپنے ساتھی اور پیارے دوست کے بچھڑنے پر مضمحل زدہ اور آزردہ خاطر ہیں۔ لیکن ان کی یادوں کا انمول خزینہ قلوب واذہان کو مسرت وانبساط بہم پہنچا رہا ہے۔ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہمیں داغِ مفارقت دے جائیں گے۔

عجب مسافتِ بے اعتبار ہے دنیا
کسے خبر کہ کہاں کون چھوڑ جائے گا

محمود صاحب کوئی ڈیڑھ سال قبل بیمار ہوئے۔ ایسا عارضہ لاحق ہوا اور کچھ ایسی صورتحال پیدا ہوگئی کہ یکا یک تین آپریشن کرانا پڑے۔ اس کڑے امتحان میں وہ بڑے صبر اور جواں مردی سے گزرے۔ وہ صحت یاب بھی ہو رہے تھے اور کالج میں بھی آتے رہے کہ یکا یک بیماری پھر عود کر آئی۔ انہوں نے بحالیٔ صحت کے لیے بڑی تگ ودو کی۔ بڑے بڑے ڈاکٹروں سے علاج کرایا۔ لیکن ملک الموت کو ضد تھی کہ جاں لے کے ٹلوں۔ دوائیں بیکار، دعائیں سپر انداز۔

الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

۲۴؍جنوری ۲۰۰۶ء بروز منگل صبح ۹ بجے طویل علالت کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اُن کی نمازِ جنازہ دارِ بنی ہاشم ملتان میں ابن امیر شریعت سید عطاء المہیمن بخاری نے پڑھائی۔ انہیں آبائی گاؤں ''غوث پور (ضلع خانیوال) میں اپنے والد مرحوم کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے کے موقع پر ہر شخص غم زدہ واداس تھا۔ اُن کے دوست احباب، رشتہ دار سب اُن کی جدائی پر اشکبار تھے۔ کچھ دوست ایسے بھی تھے جو دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ مجھے اس موقع پر امیر خسرو کا وہ مرثیہ بہت یاد آیا جو انہوں نے غیاث الدین بلبن کے بیٹے شہزادہ محمد (جو حاکم ملتان تھا اور جسے تیمور خان کے حملے میں قتل کر دیا گیا تھا) پر لکھا تھا اور شہزادے کے غم نے مرثیہ اتنا پر اثر بنا دیا تھا کہ کچھ عرصے بعد اسی غم میں غیاث الدین بلبن فوت ہوگیا تھا۔ اس مرثیے کا ایک شعر یہ ہے:

بسکہ آبِ چشمِ خلقی شد رواں در چار سو
پنج آب دیگر اندر مولتاں آمد پدید

یعنی ''لوگوں کی آنکھوں کا پانی (آنسو) اتنی روانی سے بہہ رہا ہے جیسے ملتان میں پانچ دریاؤں کا پانی آ گیا ہو۔''

© rasailojaraid.com